مولوی چراغ علی کی گمراہیاں جدیدیت پسندوں کا واحد اثاثہ

ذاتی احوال، اولاد، مذہب، افکار اور بدیسی زبان دانی کے دعوے

تحقیق: عاصم جمالی جھنگ

شجرہ خاندان مولوی چراغ علی

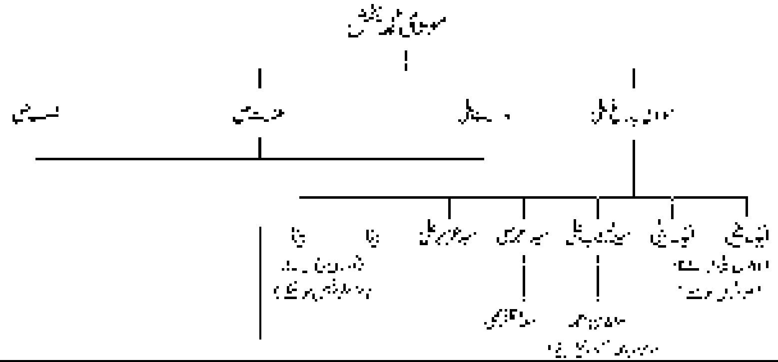

نوٹ: [سید ممتاز علی اور سید معراج علی، مولوی چراغ علی کے پوتے تھے۔ دونوں بھائی تھے جن کی ولدیت کا علم نہیں ہو سکا نیز مولوی چراغ علی کی ایک بہو بیگم عزیز علی اور پوتا سید معراج علی کراچی میں مقیم ہیں [مکتوب مرزا ظفر الحسن ادارہ یادگار غالب کراچی ۱۹۸۳ بنام راقم الحروف اور حیدر آباد کی یادوں کا مجموعہ ''دکن اُداس ہے یارو'' مصنفہ مرزا ظفر الحسن [ادارہ یادگار غالب کراچی]

نوٹ: مولوی انوار الحق اور مولوی محمد علی مولوی چراغ علی کے بھتیجے تھے لیکن اُن کی ولدیت کا تعین نہیں جا سکا ان کی ملاقات مولوی عبدالحق، بابائے اُردو سے حیدر آباد میں ہوئی تھی۔ موصوف نے مولوی چراغ علی سے متعلق بیشتر معلومات اُنہی سے لیں تھیں۔ جو ''اعظم الکلام فی ارتقاء اسلام'' مصنفہ مولوی چراغ علی کے مقدمہ میں درج ہیں۔

مولوی چراغ علی [۱۸۴۵۔۱۸۹۵ء] کے والد کا نام مولوی محمد بخش تھا۔ اُن کے آباؤ اجداد سرینگر کشمیر کے رہنے والے تھے۔ مولوی محمد بخش کلکٹر سہارنپور کے ہیڈ کلرک تھے۔ پنجاب کے مختلف اضلاع ملتان، ڈیرہ غازی خان، بنوں، شاہ پور اور سیالکوٹ میں محکمہ بندوبست کے مختلف عہدوں پر رہے۔ انگریزی دان تھے اور انگریزی لباس پہنتے تھے۔ اس لیے محمد بخش کرانی کے نام سے مشہور

تھے۔[۱] کرانی کا لفظ اس زمانے میں انگریز کلرکوں کے لئے بجائے بابو کے استعمال ہوتا تھا[۲]

موصوف کے اس عہدے پر تعیناتی کو مولوی عبدالحق قابلیت اور لیاقت کی شہادت متصور کرتے ہیں جو کسی طرح ڈپٹی کمشنر یا کلکٹر کے عہدے سے کم نہیں[۳] لیکن مولوی صاحب نے محمد بخش کی تعلیمی قابلیت اور انگریزی دانی[۴] کے حصول کی کوششوں پر کوئی روشنی نہیں ڈالی! یہ مانا کہ محمد بخش ایسے ہی قابل اور انگریزی دان ہوں گے۔ کہ حکومت وقت نے انہیں ایسے عہدے پر سرفراز کیا۔ مگر اُن کی اس قابلیت کے ارتقاء پر بھی کوئی مددگار حوالہ ہونا چاہیے تھا جو مولوی عبدالحق صاحب نے نہیں دیا ہے۔

مولوی چراغ علی کے دادا[جن کا نام مولوی عبدالحق صاحب نے درج نہیں کیا] ایک مدت تک پنجاب میں ملازم رہے۔ کیا ملازمت کرتے رہے اس کا بھی اندراج نہیں کیا اور وہاں سے میرٹھ آئے اور وہیں آباد ہوگئے۔ مولوی چراغ علی کے والد میرٹھ میں ملازم ہوئے۔ بعدازاں اُن کا تبادلہ سہارنپور ہوگیا[۵]

۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے پنجاب کا الحاق کیا تو موصوف کا انتخاب محکمہ بندوبست میں ہوا۔ اور رفتہ رفتہ مہتمم بندوبست کے عہدے پر پہنچے۔[۶] ۱۸۵۶ء میں جبکہ موصوف کی عمر پینتیس برس تھی۔ سیالکوٹ میں انتقال ہوگیا۔[۷] اور[۸] مولوی محمد بخش مرحوم کا مقبرہ میرٹھ میں موجود ہے۔[۹] یہ تصنیف مقدمہ اعظم الکلام ۱۹۱۰ء کے زمانہ کی باتیں ہیں اب اس مقبرے کی نشاندہی کوئی کرسکتا ہے یا نہیں؟ مولوی عبدالحق صاحب نے یہ معلومات مولوی زکریا سہارنپوری[وظیفہ یاب حسن خدمت سرکار نظام] سے حاصل کیں تھی جو مولوی محمد بخش اور اُن کے خاندان کو اس وقت سے جانتے تھے جب کہ مولوی محمد بخش سہارن پور میں ملازم تھے۔[۱۰]

مصنف تاریخ اقوام کشمیر،،[مولوی محمد الدین فوق] نے اپنے والد کے حوالے سے لکھا ہے کہ اُن کے دادا رجب علی ڈار ۱۸۴۹ء میں بندوبست کا کام سیکھتے تھے۔ ان کے افسر اعلیٰ کا نام مولوی محمد بخش تھا۔ وہ کشمیری تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ رجب علی بھی کشمیری ہیں تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ ان کی ذات ڈار ہے۔ تو انہوں نے اور بھی شفقت کا اظہار کیا اور انہی کے طفیل وہ سیالکوٹ میں پٹواری ہوگئے۔ میاں رجب علی کا بیان ہے کہ ان کے مہتمم بندوبست مولوی محمد بخش بھی ذات کے ڈار ہی تھے۔[۱۱]

مولوی محمد بخش مرحوم کے چار بچے تھے۔ جن کے نام چراغ علی، ولایت علی، عنایت علی اور منصب علی تھا۔ چراغ علی بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ مولوی محمد بخش کے انتقال کے وقت چراغ علی کی عمر بارہ سال سے زائد نہ تھی چراغ علی اپنے باپ کے انتقال کی وجہ سے امتحان پاس نہ کرسکے۔[۱۲] مولوی محمد بخش کے انتقال کے بعد ان کے سب اہل وعیال اُن کی والدہ، بیوی اور بچے میرٹھ واپس آگئے۔ مولوی چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیرسایہ میرٹھ میں تعلیم پائی۔ لیکن یہ تعلیم بالکل معمولی تھی اور سوائے معمولی اُردو، فارسی اور انگریزی کے نہ کسی علم کی تحصیل کی اور نہ کوئی امتحان پاس کر پائے۔

اس زمانے میں کمشنری گورکھ پور میں ضلع بستی نیا نیا قائم ہوا تھا۔ وہاں کے خزانے کے منشی گری پر بیس روپیہ تنخواہ پر مولوی چراغ علی کا تقرر ہوا۔[۱۳]

مولوی محمد زکریا جن کا اوپر ذکر ہوچکا ہے۔ اس زمانے میں سہارن پور سے ضلع بستی میں محکمہ انجینئری میں مقرر ہوکر آئے۔ قدیمی خاندانی تعلقات کی بنیاد پر دونوں ایک ہی جگہ رہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد محمد زکریا بستی کی خدمت سے مستعفیٰ ہوکر لکھنو چلے گئے۔

وہاں اُن کا تقرر ایک اچھی جگہ ہوگیا۔ موصوف نے لکھنو سے مولوی چراغ علی کو اطلاع دی کہ آپ کے والد[مولوی محمد

بخش] کے ایک محسن مسٹر گوراسلی لکھنؤ میں جوڈیشنل کمشنر ہیں۔ غالباً ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء میں مولوی چراغ علی لکھنو گئے اور مسٹر گوراسلی سے ملے۔

اتفاق سے اس وقت جوڈیشل کمشنری میں عارضی طور پر ڈپٹی منصرمی کی جگہ خالی تھی لہذا اس وقت اُن کا تقرر اسی خدمت پر بمشاہرہ[اسی روپیہ۔/۸۰ ناقل] ہوگیا۔ کچھ دنوں کے لیے بطور قائم مقام رہے بعد میں مستقل ہوگئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد سیتاپور میں تبادلہ ہوگیا۔

سرکاری کام کے بعد باقی تمام وقت مولوی چراغ علی لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ پادری عمادالدین کی کتاب ''تاریخ محمدی'' کے جواب میں آپ کا رسالہ ''تعلیقات'' اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں! ''منشور محمدی'' مخبرِ صادق لکھنو، تہذیب الاخلاق، میں آپ کے بعض مضامین شائع ہونا شروع ہوئے۔

وحدت ذوق سرسید سے اُن کے تعارف کا باعث ہوئی۔ اگرچہ اب تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خط وکتابت شروع ہوگئی تھی اور ''تہذیب الاخلاق'' میں بھی مضامین لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ جب سرسید لکھنو تشریف لائے تو مولوی صاحب مرحوم اُن سے ملنے کے لیے سیتاپور سے لکھنو گئے۔

کچھ عرصہ بعد جب ریاست حیدرآباد سے کچھ کام ترجمہ وغیرہ کا سرسید کے پاس آیا تو انہوں نے مولوی چراغ علی کو اس کام کے سرانجام دینے کے لیے منتخب کیا۔ اس بناء پر ۱۸۷۶ء میں مولوی چراغ رخصت لے کر علی گڑھ تشریف لے گئے اور کئی ماہ سرسید کے پاس رہ کر اس کام کو بکمال خوبی انجام دیا۔ جس کا معاوضہ بھی ریاست سے اُن کو ملا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۸۷۷ء میں نواب سرسالار جنگ اعظم نے بتوسط مولوی مہدی علی[نواب محسن الملک] سرسید سے ایک لائق شخص طلب کیا۔ سرسید نے مولوی چراغ علی کو منتخب کیا اور وہ حیدرآباد چلے گئے۔ جہاں آپ عہدہ اسسٹنٹ ریونیوسیکرٹری [مددگار معتمد مالگزاری] پر بمشاہرہ چار سو روپیہ پر مامور ہوگئے۔[۱۷]

نواب محسن الملک کے بعد مولوی چراغ علی کا تقرر معتمدی مالگزاری پر ہوا۔ عہدوزارت سر آسماں جاہ بہادر مولوی چراغ علی صوبہ داری ورنگل پر مامور ہوئے۔ پھر صوبہ داری گلبرگہ میں تبادلہ ہوگیا۔ دوسال بعد معتمد مال وفائنانس مقرر ہوئے مطالعہ میں بے حد شغف تھا گویا یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے رہتی تھی اور وقتاً فوقتاً نشان زد کرتے جاتے تھے۔ اور انتہا ہے کہ بیت الخلا میں بھی کتابیں رہتی تھیں، اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔ رات کو تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے۔ آرام کرنے والی کرسی پر پڑھتے پڑھتے سوگئے، اس کے بعد پلنگ پر جا لیٹے اور پڑھنے لگے۔ اتنے میں سوگئے۔ کچھ دیر کے بعد میز پر جاکر لکھنے لگے۔ مسٹر محبوب علی سپرنٹینڈنٹ مدرسہ حرفت وصنعت اورنگ آباد فرزند مرحوم اپنی والدہ کی زبانی یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ فرماتی تھیں کہ میری ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ رات کو اُن کے سینے پر سے کتاب اُٹھا کر رکھوں ورنہ کتاب کی جلد پٹھے سب ٹوٹ کر رہ جاتے۔ تین چار گھنٹے سوتے ہیں۔ اور ایک آدھ گھنٹہ ہواخوری میں گزرتا تھا ورنہ باقی تمام وقت کام میں اور خاص کر مطالعہ کتب اور تالیف وتصنیف میں صرف ہوتا۔ کتابوں کا بہت شوق تھا اور بہت سی عمدہ کتابیں جمع کی تھیں۔

مولوی انوارالحق جو مولوی چراغ علی کے بھتیجے تھے اور مولوی صاحب کے پاس بچپن سے تھے اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مولوی چراغ علی کھانا کھارہے تھے کہ نیچے تہ خانہ میں آگ لگ گئی اور وہ اسی طرح بے ہراس کھانا کھاتے رہے تھے۔ اس سے ملتا

جلتا واقعہ مولوی صاحب کے ملازم کلو کا بیان کردہ ہے جو مولوی سید تصدق حسین صاحب مہتمم کتب خانہ آصفیہ نے مولوی عبدالحق کو بتایا کہ ایک دفعہ مولوی چراغ علی شہ نشین پر بیٹھے کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اتفاق سے تہ خانہ میں آگ لگ گئی اور دھواں نکلنا شروع ہوا۔ ملازموں نے بہتیرا شور وغل مچایا کہ آگ لگ گئی مگر حضرت کو کچھ خبر نہیں۔ غرض آگ لگی اور بجھ بھی گئی مگر آپ جس طرح پڑھ رہے تھے پڑھتے رہے اور یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کیا ہوا۔

ایک دوسرا واقعہ اسی قسم کا ایک صاحب نے چشم دید مولوی عبدالحق صاحب سے بیان کیا۔ کہ ایک مقام پر تانگہ میں سوار دورہ کر رہے تھے۔ راستے میں تانگہ ٹوٹ گیا۔ آپ اُسی میں پڑے کتاب کا مطالعہ کرتے رہے لوگ گئے اور کسی دوسری جگہ سے تانگہ کا انتظام کیا اور لے کر آئے تو آپ اس میں سوار ہو کر آگے بڑھے۔

مولوی چراغ علی اپنی کتابوں کے لیے سامان جمع کرنے کے واسطے دفتر چھان ڈالتے۔ لوگوں کو بھیج کر مصر و شام و دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہنچاتے۔ چنانچہ اسی غرض سے مولوی عبداللہ ٹونکی کو بغرض تلاش کتب مصر کو روانہ کیا۔ موصوف کا وہاں سے لکھا ہوا خط مولوی عبدالحق صاحب کی نظروں سے بھی گزرا۔ [۱۴]

مولوی چراغ علی کی علمیت کے بارے میں سرسید نے تہذیب الاخلاق سلسلہ سوم جلد دوم یکم محرم الحرام ۱۳۱۳ھ میں لکھا:

متعدد علوم میں نہایت اعلیٰ درجہ کی دستگاہ تھی۔ عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے۔ عبری وکالڈی میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ [۱۷] سرسید کے اس خراج عقیدت پر بعد میں آنے والوں نے زبانوں کے علوم کے بارے میں چراغ علی کی مہارت پر اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد صاحب سرسید اور چراغ علی کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ان دونوں میں چراغ علی عہد نامہ قدیم اور عبرانی زبان سے زیادہ واقف تھے۔ [۱۸] اسی طرح آگے لکھتے ہیں۔

شبلی نعمانی کی طرح چراغ علی نے بھی فرانسیسی زبان سیکھی تھی اور کم سے کم کام چلانے کے لیے وہ کافی تھی [۱۹]

اگر تو عربی، فارس، عبری، کالڈی، لیٹن اور گریک میں سے عبرانی اور فرانسیسی کسی زبان کا مترادف نام نہیں ہے تو چراغ علی کے کھاتے میں ان دونوں زبانوں کا مزید اضافہ ہے۔

جناب پروفیسر عزیز احمد کے بیان کے مطابق سرسید اور ''چراغ علی میں سے چراغ علی عبرانی زبان کے زیادہ واقف تھے'' سے معلوم ہوا کہ دونوں عبرانی جانتے تھے۔ لیکن اگر یہ جاننا سرسید جیسا ہے تو سرسید کی عبرانی دانی تو اسقدر ہے کہ سرسید نے اپنی کتابوں اور مضامین میں جس قدر عبارتیں عبرانی کی لکھی تھیں سب ہی میں مولانا عنایت رسول کی زبردست امداد اُن کے شامل حال رہی ہے۔ [۲۰] اور خود مولانا عنایت رسول چریا کوٹی جو عیسائیوں کے مباحثے کے شوق میں عبرانی کی طرف مائل ہوئے اور کلکتہ جا کر ایک یہودی فاضل سے عبرانی زبان حاصل کی اور توریت، زبور اور انجیل کا عبرانی میں مطالعہ کیا۔ [۲۱] لیکن سرسید اور چراغ علی کا زبانوں کے اکتساب کے لئے نہ کہیں جانا ثابت ہے اور نہ ہی انہوں نے اپنے بارے میں کہیں لکھا ہے انہوں نے ان زبانوں کا اکتساب فلاں عہد میں فلاں مقام اور شخصیت سے کیا بلکہ سرسید مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کو بڑے چاؤ سے اور اصرار سے علی گڑھ بلایا کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''آپ کے یہاں تشریف لانے سے ہر قسم کے فوائد ہوں گے۔ نہ صرف مجھ کو بلکہ اور چند دوستوں کو [بھی] جو آپ کی

ملازمت کے مشتاق ہیں۔'' [۲۲]

سرسید کی عبرانی دانی میں تقدم وتأ خر کا احوال تو معلوم ہوگیا اور ساتھ ہی ''اور چند دوستوں کو [بھی] '' کے الفاظ سرسید کے اردگرد حلقہ احباب کی عبرانی لیاقت کا بھی حال یہی ہوگا۔ اگر چہ یہ خط ۱۰؍اکتوبر ۱۸۹۵ء کا ہے جو مولوی چراغ علی کے وصال سے تھوڑے عرصہ بعد کا ہے۔ لیکن اس نوع کے استفادے پہلے بھی جاری ہوں گے۔ جن سے مولوی چراغ علی بھی مُستثنیٰ معلوم نہیں ہوتے۔

اگر چہ مولوی چراغ علی کے بارے میں سرسید کے الفاظ۔ [۱] متعدد علوم میں نہایت اعلی درجہ کی دستگاہ! [۲] عبری وکالڈی میں نہایت اچھی دستگاہ! [۳] لیٹن اور گریک بقدر کاروائی جانتے تھے!

لیکن مولوی چراغ علی مرحوم کی اپنی کتب سے اس کی خاطر خواہ، اعلیٰ درجہ کی دستگاہ، اچھی دستگاہ کا ثبوت نہیں ملتا مثلاً آپ لکھتے ہیں۔

ے ''اہل مصر نے اس کاغذ کو جو ایک درخت کے پتوں سے بنایا جاتا تھا پاپو کہتے تھے۔ وہیں سے اہل یونان نے پیپروس کہنا شروع کیا۔ عبری زبان میں اسے گومی کہتے تھے۔ <u>شاید یہ لفظ قبطی زبان سے لیا گیا ہے</u> کیونکہ وہ لوگ کتاب کی جلد کو گوم کہتے ہیں اور عربی جدید میں اس کا نام بروی ہے۔۔۔۔۔'' [۲۳]

مولوی چراغ علی کو خود بھی وثوق نہیں۔ جیسا کہ خط کشیدہ الفاظ سے ظاہر ہے۔ آپ پاپئرس کو ''شاید'' قبطی سے مستعار لیا گیا کہتے ہیں اور قرینہ کاغذ کا ہے لیکن استدلال کتاب کی جلد کا ہے۔ اس پر سرسید کا دعویٰ ہے کہ آپ کو ''عبری وکالڈی میں نہایت اچھی دستگاہ تھی۔ کیا اچھی دستگاہ اشتباہ سے لبریز ہوتی ہے۔

ے ''شاید طرسیس وہی ملک ہے جو قرطاجنہ کے پاس افریقہ کے کنارے پر اور اب تونس کے نام سے موسوم ہے۔ مگر ان باتوں کی تحقیق خارج از بحث ہے'' [۲۴]

مولوی چراغ علی مرحوم ایک مفروضہ جغرافیہ کا قائم کرتے ہیں اور خود ہی اُس کو بلا استصواب خارج از بحث شمار کرتے ہیں لیکن سرسید آپ کو،، متعدد علوم کی نہایت اعلیٰ درجہ کی دستگاہ'' کا تمغہ دیتے ہیں لیکن آپ کا عجز فیصلہ اس کو خارج از بحث کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ جسے خود انہوں نے اٹھایا ہے!

ان مثالوں کی روشنی میں مولوی چراغ علی کے بارے میں سرسید کی رائے کہ آپ نہایت اعلیٰ درجہ کی دستگاہ،، اچھی دستگاہ ،، اور بقدر کاروائی جانتے تھے۔ درست معلوم نہیں ہوتی بلکہ مولوی چراغ علی مرحوم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے آپ استشہاد کی صلاحیت رکھتے تھے خواہ وہ کسی زبان سے متعلق ہو اُس کے ماہرین سے معلوم کر کے بھی شامل مضمون کر لیتے تھے وبس! اسی طرح گمان غالب ہے کہ موصوف متعلقہ زبان کے حروف تہجی کی پہچان کر کے لغت سے کام چلاتے ہوں گے!

۹ جون ۱۸۹۵ء کو مولوی چراغ علی نے سرسید کو خط لکھا جس میں بتایا کہ آپ تین ہفتہ سے بیمار تھے۔ داڑھ کے نیچے ایک گلٹی نکلی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس اندیشہ سے کہ مغز میں ورم نہ ہو جائے کلوروفارم کا عمل کر کے کاٹا اور بعد میں پھر دوبارہ کلوفارم کا عمل کیا۔ بہت ہی کمزور ہو گئے۔ کھاتے پیتے نہیں تھے۔ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تھا۔ مگر زخم بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ اور ارادہ تھا کہ تبدیلی آب وہوا کے لئے بمبئی چلے جائیں۔ [۲۵] ۱۲ جون ۱۸۹۵ء کو بذریعہ تار سرسید کو اطلاع دی کہ آپ بمبئی آ گئے ہیں۔ [۲۶]

مولوی چراغ علی کو ذیابیطس کی شکایت تھی اور یہ گلٹی اُسی کے اثر سے تھی۔ ڈاکٹروں نے علاج کیا مگر تیر کمان سے نکل

چکا تھا۔ زہر آلود خون جسم میں پھیل گیا تھا۔ ۱۵، جون ۱۸۹۵ءکو راہی ملک بقا ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔مرحوم بمبئی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔[۲۷]لیکن تاحال مولوی چراغ علی کی قبر کا سراغ نہیں مل سکا کوئی تدفین کی جگہ علی گڑہ بتاتا ھے کوئی بمبئی لیکن نہ قبر کا صحیح محل و وقوع معلوم ہوسکا نہ ھی خاندان کے لوگوں کا سراغ لگ سکا. حیرت کی بات یہ ھے کہ علی گڑہ تحریک کے صف اول کے فرد کی قبر لا پتہ ھے اور خاندان کے لوگوں کی خبر مفقود، ساحل]

مولوی چراغ علی مرحوم علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی اور بہت بڑے معاون تھے۔ سرسید کے بڑے دوست تھے۔[۲۸]مرحوم کی دو بیٹیاں اور پانچ بیٹے تھے اور ۱۹۱۰ءمیں تصنیف مقدمہ اعظم الکلام۔۔۔۔۔۔۔مولوی عبدالحق کے وقت زندہ سلامت تھے[۲۹]مرزا ظفرالحسن نے مرحوم کی صرف ایک بیٹی کا ذکر کیا ہے۔اور فرزندوں میں سے صرف دو کا نام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ایک کا نام سید محبوب علی اور دوسرے کا سید احمد علی تھا۔ثانی الذکر کے فرزند اور مولوی صاحب کے پوتے کا نام سید مظفر علی تھا۔مظفر علی صاحب مرزا ظفر الحسن کے ہم عمر تھے۔گول میز کانفرنس[۱۹۳۳ء]کے سلسلے میں سر اکبر حیدری لندن گئے۔ جہاں انہوں نے کیکسٹن ہال میں تقریر کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ ریاست حیدرآباد میں نشریاتی نظام قائم کرنے کا ارادہ ہے۔کب تک اور کس طرح یہ نہیں بتایا۔یہ اشارہ یوں بلیغ تھا کہ محبوب علی صاحب اس وقت کے مہتمم ریلوے میل سروس چھٹی پر تھے۔حکومت سے باقاعدہ اجازت لے کر تجرباتی نشریات میں مصروف تھے۔دولت چاہے کم ہو یا زیادہ محبوب علی نے خرچ کی اور دماغ مظفر علی نے لڑایا۔اگرچہ مظفر علی کی سائنس کی تعلیم نہ تھی لیکن نہ جانے کہاں سے حاصل کیے ہوئے چارٹس وغیرہ کی مدد سے انہوں نے دوسوواٹس کی طاقت کا ٹرانسمیٹر بنالیا اور اُس پر آزمائشی نشریات شروع ہوگئیں۔اس نشرگاہ کے سربراہ اور ناظم محبوب علی بنے۔اس تجرباتی نشرگاہ کو حکومت حیدرآباد نے ۲۵ ہزار روپیہ میں خرید ا تھا۔

حیدرآباد کی جان کمپنی کے سامنے والی گلی میں مولوی چراغ علی مرحوم کی رہائش تھی۔اس گلی کا نام چراغ علی گلی ہوگیا تھا۔نشریات مولوی چراغ علی کے مملوکہ مکان سے ہوتیں۔جس کا نام اعظم منزل تھا۔چراغ علی گلی نے مولوی چراغ علی کی سکونت کی وجہ سے کم اور نشرگاہ کے قیام کی بناء پر زیادہ شہرت پائی۔یہ ۱۹۳۶ء سے قبل اور مابعد کا دور تھا۔

جب پانچ سوکلوواٹس کا ٹرانسمیٹر نصب ہوگیا تو سرورنگر کی ترسیل گاہ سے پروگرام نشر ہونے لگے۔دفتر چراغ علی گلی سے منتقل ہو کر خیریت آباد[یادرمنزل]پہنچ گیا۔سید معراج علی مولوی چراغ علی کے پوتے تھے اور نشرگاہ میں ملازمت کرتے تھے۔نشرگاہ کے ملازمین میں سلطان احمد شامل تھے جو محبوب علی کے سوتیلے بیٹے تھے۔اسی طرح سید ممتاز علی چراغ علی کے پوتے اور معراج علی کے منجھلے بھائی تھے۔مظفر علی کے سوا ایک ایک کر کے محبوب علی کے خاندان کے افراد نے ملازمت ترک کردی۔فضل الرحمن کے کنٹرولر بنائے جانے سے پہلے محبوب علی بھی پنشن پر چلے گئے۔سید معراج علی ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر فوج میں چلے گئے اور وہاں کیپٹن تھے۔[۳۰]

مولوی چراغ علی کی ایک بہو بیگم عزیز علی کراچی میں کہیں مقیم ہیں۔مولوی صاحب کے ایک پوتے سید معراج علی پیرالہی بخش کالونی میں رہتے ہیں۔نشرگاہ حیدرآباد کے بانی مولوی سید محبوب علی صاحب تھے اور کئی برس پہلے ان کا انتقال ہوگیا[۳۱]مرزا ظفر الحسن راقم الحروف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: میرا مولوی محبوب علی کے گھر بہت آنا جانا تھا۔کیونکہ نشرگاہ اس گھر میں تھی۔محبوب علی صاحب اسکے ناظم اور میں اس نشرگاہ میں جزوقتی کارکن تھا۔اس گھر میں میں نے کبھی مولوی چراغ علی کا نام تک نہیں سُنا تھا۔اس گھر میں علم وادب کا کوئی چرچا نہ تھا۔[۳۲]

ایک دوسرے نوازش نامے میں مرزا ظفرالحسن صاحب نے سید معراج علی کا ایڈریس درج کیا جو یہ ہے۔[۱۱۰۸۔ پیرالٰہی بخش کالونی۔کراچی]اور ساتھ لکھا کہ معراج علی کا پتہ میں درج کر رہا ہوں ان کی طرف سے کسی حوصلہ افزاء جواب کی توقع نہ رکھئے گا۔[۳۳]اس کے باوجود میں نے موصوف کو کئی بار خطوط لکھے لیکن کسی خط کا حوصلہ شکن جواب تو کیا کسی خط کی رسید تک نہ ملی۔اپنے ایک کرم فرما کو لکھا کہ وہ کوشش کریں تو جواب ملا پی آئی بی کالونی کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔اب تو شاید وہ گھر پلازہ کی شکل اختیار کر چکا ہو گا۔[۳۴]

مولوی چراغ علی اسلامی فرقوں میں سے کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔۔۔۔۔۔جب مردم شماری ہوئی تو انہوں نے مذہب[فرقہ]کے خانہ میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے تو لفظ شیعہ لکھ دیا،مگر اپنے اور اپنے بیٹوں کے نام کے مقابل صفر صفر لکھ دیئے بظاہر ناقل اس سے اُن کی کمال بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔وہ اُس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے کی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے اور باقی تمام تفریقوں کو فضول اور لچر سمجھتے تھے۔[۳۵]

دکن کی تینوں اسلامی سلطنتیں۔احمد نگر، بیجا پورا اور گولکنڈہ کے حاکم شیعہ عقائید کے تھے۔[۳۶] جہاں پر سُنی آبادی بھی کسی طرح کم نہ تھی۔اس بارے میں،،دی امپیریل گزٹیئر آف انڈیا،،کی رائے بھی ملاحظہ ہو:

Sunnis are largely in excess in turkey and india, Shias in Persia and Afghanistan,their chief seats in india beings lucknow and Hyder-a-bad......,,

ترجمہ:۔ سُنی تُرکی اور ہندوستان بھی بہت بڑی تعداد میں ہیں۔
جبکہ اہل تشیع ایران اور افغانستان میں بکثرت ہیں۔
ہندوستان میں اہل تشیع کے مرکزی گڑھ لکھنو اور حیدر آباد ہیں۔۔۔،،[۳۷]

بے شک مذہب[فرقہ]کو’’صفر صفر‘‘ لکھنا مولوی چراغ علی نے اپنے طور پر شیعہ حکومتی علاقے میں بے تعصبی کو ظاہر کرنے کا حربہ اختیار کیا۔لیکن وہ یہ بھول گئے کہ کوئی مذہب[فرقہ]نہ ہونا یا صفر صفر ہونا بھی تو ایک فرقہ ہی ہے۔جہاں آئے دن مذہبی مناقشہ زوروں پر ہو وہاں انہوں نے یہ طریقہ اپنایا۔جو مناسب نہیں کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اس سد باب سے اُن کے بیٹوں کے مذہب[فرقہ]میں کیا یہ روش برقرار رہی؟اس کا جواب!سوائے نہیں اور کیا کہا جائے۔اس مضمون کے شروع میں ہی درج کردہ شجرہ نسب میں ملاحظہ ہو کہ مولوی چراغ علی اور اُن کے والد اور جملہ برادران مولوی کہلائے لیکن مولوی چراغ علی کی اولاد نے یعنی پہلی ہی نسل نے اپنے آپ کو،،سید،،کہلانا شروع کر دیا۔جبکہ یہ لوگ نسلاً کشمیری’’ڈار‘‘ تھے۔جیسا کہ اوپر مضمون کے شروع میں ہی تواریخ اقوام کشمیر کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے۔اسی طرح’’سید‘‘کہلانا بھی اہل تشیع ہونے کا ایک علامتی سابقہ/لاحقہ سمجھا جاتا ہے۔جب کہ نشرگاہ حیدر آباد بقول ایک صحافی کے سید محبوب علی فرزند مولوی چراغ علی اور آپ کے خاندان کی ہی عملاً ملکیت تھی۔جہاں تقریباً سارا عملہ ہی افراد خاندان تھے۔پھر صحافی مذکور یہ کہنے میں حق بجانب تھا:

’’نشرگاہ کو ایسا جزیرہ قرار دیتا تھا جس میں اک خاندان کے افراد بسے ہوتے ہیں‘‘[۳۸]اس جزیرے میں اُن کی یہ روش اہل تشیع مسلک کی غمازی کرتی ہے یعنی:’’ایک زمانہ تھا جب نشرگاہ یکم محرم سے اربعین تک پورے پچاس دن بالکل بند رہتی تھی۔[۳۹]سارے کارکن محبوب علی صاحب کے خاندان کے اراکین تھے۔اور ویسے بھی’’الناس علی دین ملوکہم‘‘ کے مطابق مولوی چراغ

علی کا اپنی بیوی کا مذہب[فرقہ]شیعہ لکھوانا اُن کے شیعہ ہونے پر دال ہے۔

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

مولوی چراغ علی مرحوم کی تصنیفات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک حصہ سرکاری حیثیت سے تصنیف کردہ کتب اور دوسرا حصہ اتباع سرسید سے پہلے اور بعد کی مذہبی تصانیف کا ہے۔یہ سینکڑوں صفحات کی تالیفات اوپر سے سرکاری فرائض منصبی اس پر مستزاد متعدد بدیسی زبانوں میں اعلیٰ رااچھی دستگاہ!لیکن کسی معلم کی تعلیم سرے سے مفقود!اور نہ ہی یہ اقرار کہ انہوں نے فلاں ذریعہ سے یہ معلومات اکٹھی کی ہیں!!!اس ضمن میں مولوی چراغ علی کے انبیاء کرام کے بارے میں خیالات کا ذکر بے جا نہ ہوگا جو اس سلسلے میں مفید بحث ہے:۔

''وحی والہام قوائے انسانی کا قدرتی نتیجہ ہیں۔پیغمبر کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے نفس کو اللہ تعالیٰ نے منور کر دیا ہے۔اور جو خیالات وہ ظاہر کرتا ہے اور جن کو اس اثر سے متاثر ہو کر تقریر یا تحریر میں لاتا ہے وہ''خدا کے الفاظ'' سمجھے جاتے ہیں۔''[۴۰]

مولوی چراغ علی مرحوم کو اپنے بارے میں وحی والہام کا دعویٰ تو نہیں تھا۔پھر کیا اُنہیں اپنے مزعومہ خیالات کی رُو سے کیا ''خدا کے الفاظ'' کہنے کا یقین تھا کہ انہیں متعدد زبانوں میں اعلیٰ دستگاہ میسر آ گئی؟!وحی والہام کے بارے میں ان تصورات کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔البتہ سرسید کے توسط سے یہ انہیں برہمو سماج تصورات کا پیوند اسلامی عقائد میں لگانے کا موقعہ ملا۔جنہیں افسوس ہے کہ دفاع اسلام کا نام دیا جاتا ہے۔

مولوی چراغ علی کی شخصیت کا یہ پہلو متعدد زبانوں میں دستگاہ کے معاملے میں موصوف کو سرسید اور مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کے تعلقات دربارہ عبرانی حوالہ جات ایسا ہی ثابت کرتی ہے۔ایک اور مضمون نگار مولوی چراغ علی مرحوم کی زبان دانی میں ایک اور زبان کا اضافہ کرتے ہیں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔

''اُنہیں عبرانی اور سریانی زبان سے بھی واقفیت تھی،،[۴۱]لیکن اس انکشاف کا کوئی ماخذ نہیں درج کیا۔

سطور گزشتہ میں مولوی چراغ علی مرحوم کے مذہب[فرقہ]کا ذکر کیا گیا۔اس سے راقم الحروف کے بارے میں کوئی غلط تاثر نہ لیا جائے۔سید صاحب[سید امیر علی]شیعہ تھے۔لیکن جس طرح ہندوستان کے سُنی مسلمانوں نے اپنی تمدنی اور سیاسی زندگی میں شیعہ سُنی کا کوئی خیال نہیں رکھا اور اپنی زندگی کے کئی اہم مرحلوں پر اپنی قسمت کی باگ آغا خان،مسٹر محمد علی جناح،مہاراجہ صاحب محمود آباد اور دوسرے شیعہ حضرات کو سونپ دی۔اسی طرح شیعہ طبقے کی بہترین اور قابل فخر ہستیوں نے اپنی زندگی اور اپنے سیاسی وتمدنی مشاغل میں فرقہ وارانہ اختلافات کو کوئی جگہ نہیں دی۔۔۔۔[۴۲]اب یہ باتیں اگرچہ قصہ پارینہ ہوگئی ہیں لیکن اب ان کی ضرورت پہلے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

مولوی چراغ علی کی سرکاری حیثیت سے تصنیف کردہ کتب درج ذیل ہیں۔

۱۔بجٹ[موازنہ] ۲۔ایڈمنسٹریشن رپورٹ[رپورٹ نظم ونسق بابت ۵۸۔۱۸۸۴] ۳۔حیدرآباد دکن انڈر سر سالار جنگ[چار ضخیم جلدیں]۴۔جاگیرات وجاگیرداران

مولوی صاحب مرحوم کی درج ذیل مذہبی تصائیف ہیں۔

ا۔تعلیقات ۲۔تحقیق الجہاد [انگریزی] ترجمہ خواجہ غلام الحسنین ۳۔ریفارمزانڈر مسلم رول [انگریزی] مترجمہ مولوی عبدالحق بعنوان اعظم والکلام فی ارتقاء اسلام ۴۔محمد دی ٹروپرافٹ [انگریزی] ۵۔اسلام کی دنیوی برکتیں ۶۔قدیم قوموں کی مختصر تاریخ ۷۔کئی رسالے ناتمام چھوڑے مثلاً بی بی ہاجرہ، ماریہ قبطیہ، تعلیق نیاز نامہ، غلامی، تسری، تعدد ازدواج۔ ناسخ منسوخ، ردشہادت قرآن برکتب ربانی

مولوی صاحب کی مذہبی تصانیف سے متعلق ایک الگ مضمون'' مولوی چراغ کے دلائل بحق جدیدیت اور جدیدیت پسندوں کے دلائل کا تقابلی مطالعہ'' میں تفصیل سے بات کی جائے گی۔اصولی طور پر مولوی چراغ علی مرحوم سرسید کی اتباع میں ہندوؤں کی تحریک برہموسماج سے شدید متاثر تھے۔ اور اسی کے اصولوں کو اسلام پر منطبق کرتے رہے یہ باتیں دوسرے مضمون میں ملاحظہ ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

حواشی

[۱] تواریخ اقوام کشمیر، محمد الدین فوق، ص۳۹۱، نگارشات پبلشرز مزنگ روڈہ لاہور۲۰۰۳ء۔[۲] اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام، مولوی چراغ علی، مقدمہ مولوی عبدالحق حصہ اول ص۲، مطبع مفید عام آگرہ، شائع کردہ مولوی عبداللہ خان حیدرآباد دکن کتب خانہ آصفیہ، ۱۹۱۰ء۔ [۳] ---ایضاً ص۴۔ [۴] ---ایضاً ص۲۔ [۵] ---ایضاً ص۲۔ [۶] ---ایضاً ص۶۔ [۷] ---ایضاً ص۴۔۵۔ [۸] تواریخ اقوام کشمیر، محمد الدین فوق، ص۳۹۱۔ [۹] مقدمہ اعظم الکلام ---مولوی عبدالحق، ص۵۔ [۱۰] ---ایضاً---ص۲۔ [۱۱] تواریخ اقوام کشمیر، محمد الدین فوق، ص۳۹۱۔ [۱۲] ---ایضاً ص۳۹۲۔ [۱۳] مقدمہ اعظم الکلام ---مولوی عبدالحق، ص۵۔ [۱۴] ---ایضاً ص۵۔۶۔۷۔ [۱۵] ---ایضاً ص۹۔ [۱۶] ---ایضاً ص۲۔۱۳۔۱۴۔۱۵۔ [۱۷] ---ایضاً ص۳۰۔ [۱۸] برصغیر میں اسلامی جدیدیت، پروفیسر عزیز احمد [ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی] ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲۔کلب روڈ لاہور، طبع دوم، ۱۹۹۷ء، ص۹۵۔ [۱۹] ---ایضاً---۔ [۲۰] مکتوبات سرسید، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۳۷۵۔ [۲۱] ---ایضاً---۔ [۲۲] ---ایضاً ص۳۷۷۔ [۲۳] مضامین تہذیب الاخلاق [جلد سوم] عالی جناب نواب اعظم یار جنگ مولوی محمد چراغ علی خان صاحب، ملک فضل الدین ملک چنن الدین ملک تاج الدین ککے زئی تاجران کتب قومی منزل نقشبندیہ کوچہ ککے زئیاں، بازار کشمیری، لاہور ص۱۱۶۔ [۲۴] ---ایضاً---ص۱۵۰۔ [۲۵]۔مقدمہ ''اعظم الکلام---'' مولوی عبدالحق، ص۳۰۔ [۲۶] ---ایضاً۔ [۲۷] ---ایضاً۔ص ۲۷۔۲۸۔ [۲۸] ---ایضاً۔ص۔۳۰۔ [۲۹] ---ایضاً۔ص۔۳۰۔ [۳۰] دکن اداس ہے یارو، مرزا ظفر الحسن، ادارہ یادگار غالب کراچی، جنوری ۱۹۷۸ء ص۔۵۹۔۶۰۔۶۱۔۶۲۔۶۷۔۶۳، ۶۷۔۶۸۔۷۰۔۸۲۔۱۱۲۔ [۳۱]۔مکتوب مرزا ظفر الحسن صاحب بنام راقم الحروف مورخہ ۲، مارچ ۱۹۸۳ء۔ [۳۲] ---ایضاً---[۳۳] ---ایضاً---مورخہ ۱۸، مارچ ۱۹۸۳ء۔ [۳۴] مکتوب جناب سید خالد جامعی صاحب ناظم شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی بنام راقم الحروف۔تاریخ ندارد، موصولہ ۲۶ مئی ۲۰۰۶ء۔ [۳۵]۔مقدمہ ''اعظم الکلام---'' مولوی عبدالحق، ص۲۲۔۲۳۔ [۳۶]۔تاریخ جنوبی ہند، محمود بنگلوری، پبلشرز یونائیٹڈ چوک انارکلی لاہور، بارہ روم ۱۹۴۷ء ص۳۸۲ [۳۷] "The Indian Empire Vol-I (Descriptive) Oxford 1907 Chapter VIII by W.Crooke Page 436 [۳۸] دکن اداس ہے یارو، مرزا ظفر الحسن، ادارہ یادگار غالب کراچی۔ص۔۶۳ [۳۹] ---ایضاً---ص۔۸۱ [۴۰] تحقیق الجہاد مولوی چراغ علی، ۱۸۸۴ء مترجمہ خواجہ غلام الحسنین، مکتبہ دانش مزنگ لاہور۔ [۴۱] سرسید کے ہم خیال علماء کے دینی نظریے، سید محمد عبداللہ ایم اے ڈی لٹ، اورئنٹیل کالج میگزین، نومبر ۱۹۳۸ء۔ص۔۵۶ [۴۲] موجِ کوثر، شیخ محمد اکرام، فیروزسنز لاہور، نویں بار ۱۹۷۰ء۔ص۔۱۷۱۔